صفیہ صدیقی

دیدہ ور

سچ پوچھئے تو اسکول اوف اورینٹل اینڈ ایفریکن اسٹڈیز میں جانے سے پہلے میں نے رالف رسل کا نام بھی نہیں سنا تھا، پہلی ملاقات ہی میں مجھے ان سے بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوئی کیوں کہ ان کا اخلاق اتنا اچھا تھا ورنہ میں نئے لوگوں سے ملنے اور بات کرنے سے بہت گھبراتی ہوں، اور پھر ایک یونی ورسٹی کے استاد سے تو اور بھی۔ وہاں تمام استادوں میں میں صرف رسل صاحب سے بے تکلف تھی، جس کی وجہ ان کا بے تکلفانہ انداز گفتگو اور خوش وخرم رویہ تھا۔

رالف رسل صاحب ایک بے حد سچے اور کھرے انسان تھے۔ خود بھی سچ کہتے تھے اور سچ ہی سننا پسند بھی کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ لوگ ان سے وعدے تو کر لیتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے۔ عموماً یہ بات ہم پاکستانیوں کے بارے میں ہوتی تھی جو ان سے اردو زبان کی ترویج کے لیے رقم دینے کے وعدے تو کر لیتے تھے مگر ادائیگی میں تاخیر کرنے پر انھیں ذرا سا احساس ذمے داری بھی نہیں ہوتا تھا اور نہ اپنے وعدے کا احترام نہ کرنے کا خیال۔ رسل صاحب انسانوں میں طبقاتی نظام کے سخت خلاف تھے اور ایسے لوگوں سے ملنا جلنا پسند بھی نہیں کرتے تھے جن کی پیشانی پر امارت اور تفخر کی سلوٹیں نمایاں ہوں اور آواز میں رعب کی درشتی ہو۔ انھیں القاب وآداب بھی سخت ناپسند تھے۔

جب انگلستان میں برصغیر سے آئے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تو یہاں بھی ادبی نشستیں اور مشاعرے وغیرہ منعقد ہونے لگے۔ اکثر رسل صاحب بھی ان میں مدعو کئے جانے لگے اور دعوت ناموں میں ان کا نام بہت فخر سے لکھا جانے لگا۔ نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' یا ''پروفیسر'' بھی لکھا ہوتا؛ رسل صاحب ہمیشہ اس کی تردید کرتے کہ وہ نہ ڈاکٹر ہیں نہ پروفیسر۔ وہ اس پر الجھتے مگر یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دفعہ میں نے ایک دعوت نامے پر ان کا نام دیکھ کر ہنس کر ان سے کہا کہ دیکھئے وہ ابھی تک آپ کو ''ڈاکٹر'' رسل لکھ رہے ہیں، تو

بولے، بھئی میں نے اب ان لوگوں سے کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تب میں نے انھیں بتایا کہ ہم لوگ کسی ایسے شخص کا احترام نہیں کر سکتے جس کے نام کے آگے کوئی لقب وقب نہ ہو۔ یہ بات تو ہماری گھٹّی میں پڑی ہوئی ہے۔ مگر وہ اس بات پر خوش نہ تھے۔ رسل صاحب اسٹیبلش مینٹ سے ہمیشہ خفا رہتے تھے، انھوں نے مجھے بتایا کہ سو ایس (SOAS) میں ادارے کے اعلیٰ عہدے دار بھی مجھ سے یہی چاہتے تھے کہ پی ایچ ڈی کروں، مگر میں تو پی ایچ ڈی کرنے والوں کی رہ نمائی کر رہا تھا مجھے اس کی کیا ضرورت تھی۔ ان کا یہ فیصلہ ادارے کو پسند نہیں آیا، اور بعد میں ان کی جگہ کسی اور کو شعبے کا صدر بنا دیا گیا تھا۔

میں نے مولانا حسرت موہانی کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ ایک دفعہ علی گڑھ یونی ورسٹی نے انھیں مدعو کیا تھا اور ایک جم غفیر انھیں لینے کے لیے اسٹیشن پر ہار وغیرہ لے کر آیا تھا۔ گاڑی آنے کے بعد لوگ ان کو ڈھونڈتے پھرے اور پوری گاڑی دیکھ ڈالی لیکن مولانا کہیں نظر نہ آئے۔ جب کچھ لڑکے واپس جا رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک تعمیری جگہ پر کچھ مزدور آگ جلائے بیٹھے تھے اور کھانا کھا رہے تھے اور مولانا بھی ان کے ساتھ بیٹھے دال روٹی کھا رہے تھے۔ اس پر لڑکوں نے حیرانی سے پوچھا مولانا آپ اور یہاں! ہم تو آپ کو اسٹیشن پر ڈھونڈھ رہے تھے۔ مولانا بولے کہ بھئی اسٹیشن پر بھیڑ بہت تھی۔ میں نے سوچا کوئی بڑا آدمی آیا ہوگا۔ سو میں پیچھے سے اتر کر چپکے سے چلا آیا۔ رسل صاحب بھی ایسا ہی ایک واقعہ سناتے تھے اور شاید انھوں نے کہیں یہ لکھا بھی ہے کہ ایک دفعہ وہ علی گڑھ جا رہے تھے اور شاید ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ٹھہرنا تھا۔ ذاکر صاحب کا ڈرائیور فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ان کو ڈھونڈھتا رہا، پھر واپس جانے ہی والا تھا کہ ایک تھرڈ کلاس کے ڈبّے سے رسل صاحب نکلے۔ وہ راستے بھر مونگ پھلی کھاتے اور ڈبے کے دیہاتیوں سے ہنستے بولتے، اور بہ قول اپنے، زبان سیکھتے آئے تھے۔ حسرت موہانی کی شاعری اور درویشانہ رویہ مجھے متاثر کرتا تھا۔ رسل صاحب نے بتایا کہ وہ بھی حسرت موہانی کو بہت پسند کرتے ہیں کیوں کہ وہ بہت سچے، نڈر اور بے باک انسان تھے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے، رسل صاحب سے میری ملاقات ۱۹۷۸ میں سوایس میں ہوئی جب میں نے ایک ذرا بڑی عمر کی طالبہ کی حیثیت سے داخلے کی درخواست دی تھی اور چوں کہ وہ ''انڈولوجی'' کے شعبے میں اردو کے سربراہ تھے، میرا انٹرویو لے رہے تھے۔ اس کے بعد میری ان سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔

وہ ایک کلاس بھی پڑھاتے تھے، مجھے ابھی تک شرمندگی کے احساس کی وہ کیفیت یاد ہے جب میرے

بھاگم بھاگ کلاس میں شامل ہونے کی کوشش کے باوجود میں تاخیر ہی سے پہنچتی اور اپنے دفتر میں دوسری طالب علم لڑکیوں کے ساتھ کلاس لیتے ہوئے رسل صاحب کہتے، ''صفیہ، یو آر ٹین منٹس لیٹ۔'' میں اپنی سی کوشش کرتی کہ کلاس میں دیر سے نہ پہنچوں، لیکن کبھی ٹرین دیر سے آتی، کبھی لفٹ وقت پر آ کر نہ دیتی، اور یوں کہیں نہ کہیں دس منٹ ادھر ادھر ہو ہی جاتے۔ یہ طالبات اٹھارہ انیس برس کی تھیں اور میں جوان سے عمر میں کہیں بڑی تھی شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ رسل صاحب میرا بہت خیال کرتے تھے مگر غلطی پر مجھے بھی بخشتے نہیں تھے۔ یہ لڑکیاں میری بہت عزت کرتیں اور اس کی معترف تھیں کہ میں گھر کی ذمے داریوں کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوا لیس چھوڑنے کے بعد جب کبھی رسل صاحب سے لکھنے پڑھنے کی بات ہوتی تو وہ کہتے، ''صفیہ آپ معقول انسان ہیں۔'' وہ اس سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ ''معقول'' ان کی تعریف کی انتہا تھی۔ اور جب میں کہتی کہ لوگ تو مجھے نامعقول سمجھتے ہیں، تو وہ بہت محظوظ ہوتے۔ ہمارے یہاں جس طرح لکھنے والے تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ آپ لوگ ابھی تک داستانوں والی زبان لکھتے ہیں، حقیقت سے دور پرے۔ جس طرح یہاں استاد اور طالب علم ایک دوسرے کو پہلے نام سے مخاطب کرتے ہیں، اسی طرح طالب علم انھیں بھی ''رالف'' کہہ کر مخاطب کرتے، مگر وہ سب انگلستان میں نشو و نما پانے والے بچے تھے اور میں ایک دوسری تہذیب کی پروردہ تھی جہاں بڑوں کا احترام کرنے کی روایت تھی۔ ان کا احترام تو خیر یہ طالب علم بھی کرتے تھے مگر میں نے رسل صاحب سے کہہ دیا کہ میں آپ کو رسل صاحب ہی کہوں گی۔ وہ ہماری تہذیب سے بہ خوبی واقف تھے اس لیے ہنس کر کہا ٹھیک ہے آپ کی جو مرضی ہو کہیے۔ ان کی ہدایت تھی کہ میں آسان زبان میں لکھا کروں تاکہ یہاں کے اردو داں بچے بھی پڑھ سکیں۔ اور ان کا کہنا تھا کہ سچ کہنے اور لکھنے سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے۔

رسل صاحب کو اردو سے بہت محبت تھی اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرتے اور لوگوں کو اس کے پڑھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں جو ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ میں ہونی ہی چاہیے تھیں ان کی عدم موجودگی کا اندازہ مجھے ان کے طرز عمل سے ہوا۔ ہمارے معاشرے میں عقیدے اور کردار کا جس قدر تضاد ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مجھے اپنے اوپر بہت بھروسا تھا کہ ایک باشرع خاندان میں جہاں قناعت، سخاوت، اور سچائی پر بہت زور تھا، وہاں مجھ میں کچھ کم زوریاں اول تو ہوں گی نہیں اور اگر ہوئیں تو بہت کم۔ لیکن رسل صاحب سے تعلق رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ یہ

گرہ کھلتی گئی کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کتنی اہمیت رکھتی ہیں، اور مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھے پہلے ہی اس بات کا خیال ہونا چاہیے تھا کہ میری سچائی سے بھی کسی کو دکھ پہنچ سکتا ہے، اس کی خود اعتمادی متزلزل ہوسکتی ہے، اور یہ بات اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ کسی مسئلے پر دو آدمیوں کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے اور دونوں کا نقطۂ نظر ان کے عقیدے، حالات، اور تجربے کے لحاظ سے درست ہوسکتا ہے۔ ہمیشہ اپنی بات کو ہی صحیح سمجھنا تنگ نظری بھی ہوسکتی ہے، کیوں کہ ہر مسئلے، واقعے اور حادثے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوتی کہ میں نے یہ سب پہلے کیوں نہیں سوچا یا اس رخ پر میری نظر پہلے کیوں نہیں گئی۔

ایک مرتبہ ہم کلاس میں مذہب پر بات کر رہے تھے۔ رسل صاحب نے مجھ سے میرے عقیدے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا آپ نے کبھی اس عقیدے پر غور بھی کیا۔ میں نے کہا کہ ہاں، اور اکثر۔ انھوں نے سوال کیا کہ آپ کو اپنے مذہب کی کیا بات پسند ہے۔ میں نے کہا کہ سردست میں اس کی صرف دو خوبیاں بتا سکتی ہوں: پہلی تو یہ کہ میرے مذہب میں ہر انسان برابر ہے، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ رسل صاحب مسکرائے۔ چوں کہ وہ ایک زمانے سے برّصغیر آتے جاتے رہے تھے، انھیں خوب معلوم ہوگا کہ روزمرہ کی زندگی میں اس برابری کا اطلاق کتنا تھا۔ بہ ہر کیف، اس گفتگو پر کلاس کی ایک سوشلسٹ ملک پولینڈ سے آئی ہوئی طالبہ کی توجہ بھی میری طرف ہوگئی۔ پھر میں نے دوسری خوبی کا ذکر کیا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم کسی کی دل آزاری کرو گے تو میں بھی تم کو اس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک وہ شخص تم کو معاف نہ کر دے۔... یہ سن کر وہ لڑکی بولی ایسے مذہب کو تو میں بھی مان سکتی ہوں۔ مگر اس دن گھر واپس آتے ہوئے ٹیوب میں راستے بھر میرے دماغ میں میرے عقیدے کے یہ دو پہلو جن کو میں بہت فخر سے بیان کر آئی تھی دھما چوکڑی مچاتے رہے، اور میں شرمندگی اور خجالت کی بارش میں بھیگتی رہی... اب مجھے اپنے معاشرے کی منافقت بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔

رسل صاحب میرے افسانے پڑھتے اور ان پر گفتگو بھی کرتے۔ میری ایک کہانی ''اجنبی دوست'' کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ یہ انھیں بہت پسند آئی تھی، البتہ اس کا اختتام پسند نہیں آیا تھا۔ بعد میں میں نے کہانی کو تھوڑا سا اور آگے بڑھایا اور یہ اختتام انھیں پسند آیا تھا۔ جب وسکانسن کے محمد عمر میمن صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اچھی خاصی کہانی کو ایک کم زور اختتام کیوں دے دیا، مگر پھر رسل صاحب کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ [یہ خاموشی پاسِ ادب کے باعث تھی؛ کہانی کے بارے میں میری رائے اب بھی وہی ہے۔

م۔ع۔م۔] ایک کہانی کے بارے میں دو اہم ادیبوں کی آرا کتنی مختلف ہوسکتی ہیں اس وقت یہ بات میرے لیے حیران کن تھی۔ ان کو میرے چند اور افسانے پسند آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ وقت ملنے پر میں ان کا ترجمہ کروں گا، لیکن ان کی مصروفیت کے باعث اس کی نوبت نہ آسکی۔ ۲۰۰۸ میں شائع ہونے والا میرا ناول پڑھ کر رسل صاحب نے مجھ سے کہا، ''اس میں بچے نہیں ہیں۔'' میں نے بتایا کہ یہ اس زمانے کی روداد ہے جب یہاں نوجوان عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ آئی تھیں اور انھیں ایک نئی دنیا ایک نئے کلچر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

رسل صاحب پر یہ سب کچھ لکھتے ہوئے مجھے عجیب سے جذبات سے واسطہ ہے اور ان کی بہت سی باتیں بے اختیار یاد آرہی ہیں۔ جب میرے بیٹے کی اچانک موت کی اطلاع انھیں پہنچی تو انھوں مجھے ایک کارڈ بھیجا تھا اور اظہار ہم دردی کے بعد لکھا تھا۔ ''اب آپ کو صبر و شکر کرنا ہوگا۔'' میں نے جواب میں لکھا، ''صرف صبر۔ شکر نہیں۔''

سوالیس کے دوسرے سال میں میں کرسمس کی چھٹیوں میں پاکستان گئی۔ وہاں میری ساس بہت بیمار تھیں (جو بعد میں فوت ہوگئیں)۔ اس لیے مجھے رکنا پڑا۔ میں نے رسل صاحب کو خط لکھا کہ شاید مجھے واپسی میں کچھ تاخیر ہوجائے، اور وجہ بھی بیان کردی۔ جب میں واپس آئی تو میری کلاس کی جو بھی لڑکی مجھے ملتی وہ پوچھتی آپ کی ساس کیسی ہیں۔ میں بہت حیران ہوتی کہ ان سب کو کیسے پتا چلا۔ عقدہ کھلا کہ رسل صاحب نے میرا خط کلاس میں طالب علموں کو ترجمے کی مشق کے لیے بلیک بورڈ پر لگا دیا تھا۔

جب کلاس میں میری ملاقات رسل صاحب سے ہوئی تو میں نے پوچھا، ''کیا آپ ہر طرح کے خط اس طرح بلیک بورڈ پر ترجمے کے لیے لگا دیتے ہیں؟'' وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسے، وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے۔ جواب دیا، ''نہیں، ہر طرح کے خط نہیں۔'' پھر بتایا تھا کہ ان کے پاس دوستوں کے جو خط آتے ہیں وہ اپنی کلاس میں اردو کی مشق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ سوالیس کی تاریخ کا پہلا خط تھا جو یونی ورسٹی کو کسی طالب علم نے کلاس میں تاخیر سے پہنچنے کی بابت بھیجا تھا۔

رسل صاحب بڑے مزے سے کہتے تھے کہ ''میں ملحد ہوں۔'' وہ خدا کو نہیں مانتے تھے مگر اس کے بندوں سے بہت قریب تھے۔ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ بڑی عزت کرتے تھے۔ ہندو یاک کے کتنے ہی لوگوں

کے ذہن میں ان کا شفیق، ہنستا ہوا چہرہ محفوظ ہوگا۔ رسل صاحب یقیناً اپنے بچوں سے بھی قریب رہے ہوں گے تبھی تو ان کے آخری وقت میں وہ سب ان کے پاس تھے اور سب دوست اور شناسا بھی جو ان سے عقیدت رکھتے تھے، محبت کرتے تھے، جو ان کے شاگرد تھے، سب ہی ان کو رخصت کرنے آئے تھے۔ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری اور زندگی کا ایک ایک دن کارآمد گزارا، کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے۔ کسی نہ کسی کو اردو پڑھاتے ہوئے۔ خواہ وہ ڈاکٹر ہو یا سماجی کارکن۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔❑